رما۔ رہاں ہے تو۔

دیبی۔ مگر ہمت نہ ہوگی۔

رما۔ بہت ٹھیک کہتے ہو دادا۔ جب سے شادی ہوئی اپنی لڑکی تک کو تو بلایا نہیں!

دیبی۔ سمجھ گیا بھیّا۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ بیٹے کے لئے کہو چوری کریں بھیک مانگیں۔ بیٹی کے نام گھر میں کچھ ہے ہی نہیں۔

تین دن سے رما کو نیند نہ آئی تھی۔ دن بھر روپیوں کی فکر میں مارا مارا پھرتا رات بھر تارے گنا کرتا۔ اس وقت باتیں سنتے سنتے اسے نیند آگئی۔ گردن جھپکی لینے لگا۔ دیبی دین نے فوراً اپنی گٹھری کھولی اس میں سے ایک دری نکالی اور تختہ پر بچھا کر بولا۔ اس پر لیٹ رہو بھیّا۔ میں تمہاری جگہ بیٹھا جاتا ہوں۔

رما لیٹ رہا۔ دیبی دین بار بار محبت آمیز نگاہوں سے دیکھتا تھا گویا اس کا اپنا لڑکا کہیں سے لوٹا ہو۔

(۲۲)

جب رما نیچے اوپر سے نیچے آنر رہا تھا اس وقت جالپا کو اس کا ذرا بھی اندیشہ نہ تھا کہ وہ گھر سے بھاگا جا رہا ہے اس نے وہ رقعہ پڑھ لیا تھا۔ اسے ایسا اشتعال ہو رہا تھا کہ جا کر رما کو خوب کھری کھری سنائے۔ مجھ سے یہ دغا۔ مگر ایک ہی لمحہ میں اس کا غصہ فرد ہو گیا۔ خیال آیا کہیں ایسا تو نہیں ہوا ہے کہ سرکاری روپے خرچ کر ڈالے ہوں۔ ضرور یہی بات ہے رتن کے روپے صراف کو دے دیئے ہونگے۔ اس دن رتن کو دکھلانے کے لئے شاید وہ سرکاری روپے اٹھا لائے تھے اسی کو پورا کرنے کے لئے روپیوں کی ضرورت ہوگی۔ یہ سوچکر اُسے رما پر غصہ آیا۔ یہ مجھ سے کیوں اتنا پردہ کرتے ہیں کیوں

مجھ سے بڑھ بڑھ کر باتیں کرتے تھے۔ کیا میں اتنا بھی نہیں جانتی کہ دنیا میں امیر و غریب دونوں ہی ہوتے ہیں۔ کیا سبھی عورتیں زیوروں سے لدی ہوئی ہوتی ہیں۔ جب ضروری کاموں سے روپے بچتے تب زیور بھی بن جاتے ہیں۔ پیٹ اور تن کاٹ کر چوری یا بے ایمانی کر کے تو زیور نہیں بنوائے جاتے۔ کیا انہوں نے مجھے اتنا خود غرض سمجھ لیا ہے۔

اس نے سوچا، رما اپنے کمرے میں ہوں گے۔ چل کر پوچھوں کون کون سے زیور چاہتے ہیں صورت حال کتنی خطرناک ہے اس کا خیال کر کے اس کے دل پر غصے کے بجائے خوف طاری ہو گیا، وہ بڑی تیزی سے نیچے اتری۔ اسے یقین تھا کہ رما نیچے بیٹھے ہوئے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مگر کمرے میں آئی تو ان کا پتہ نہ تھا۔ سائیکل رکھی ہوئی تھی فوراً دروازہ سے جھانکا، سڑک پر بھی نہیں۔ کہاں چلے گئے دونوں لڑکے اسکول گئے تھے کس کو بھیجے کہ جا کر انہیں بلا لاوے۔ اس کے دل پر موہوم دہشت کا غلبہ ہوا۔ فوراً اوپر گئی گلے کے ہار اور ہاتھ کے کنگن رومال میں باندھے پھر نیچے اتری۔ سڑک پر آ کر ایک تانگا لیا اور کوچوان سے بولی، چنگی کچہری چلو۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اتنی دیر پس و پیش میں کیوں پڑی رہی کیوں نہ فوراً زیور اتار کر انہیں دیدیئے۔

راستہ میں وہ دونوں طرف غور سے دیکھتی جاتی تھی کیا اتنی جلدی دور نکل آئے شاید دیر ہو جانے کے باعث وہ بھی آج تانگے پر ہی گئے ہیں نہیں تو اب تک ضرور مل گئے ہوتے۔ تانگے والے سے بولی۔ کیوں جی تم نے ابھی کسی بابو جی کو تانگے پر جاتے دیکھا ہے تانگے والے نے کہا۔ ہاں بہو جی ابھی ادھر سے تو گئے ہیں۔

جالپا کو کچھ تسکین ہوئی۔ رما کے پہنچتے پہنچتے وہ بھی پہنچ جائے گی۔ کوچوان سے بار بار گھوڑا بڑھانے کو کہتی تھی جب وہ دفتر پہنچی تو گیارہ بج گئے تھے سینکڑوں آدمی اِدھر اُدھر دوڑتے نظر آتے تھے۔ کس سے پوچھے۔ کس کے پاس جائے۔ وہ نہ جانے کہاں بیٹھتے ہیں۔

دفتر کا چپڑاسی دکھائی دیا۔ جالپا نے اسے بلا کر کہا۔ سنو جی۔ ذرا بابو رمانا تھ کو تو بلا لاؤ۔

چپڑاسی بولا۔ انہیں کو تو بلانے جا رہا ہوں۔ بڑے بابو نے بھیجا ہے آپ کیا ان کے گھر ہی سے آ رہی ہیں۔

جالپا۔ ہاں میں تو گھر ہی سے آ رہی ہوں۔ ابھی دس منٹ ہوئے وہ گھر سے چلے گئے ہیں۔

چپڑاسی۔ یہاں تو نہیں آئے۔

جالپا کو بڑی تشویش ہوئی۔ وہ یہاں بھی نہیں آئے۔ راستہ میں بھی نہیں ملے۔ تو پھر گئے کہاں۔ کسی سانحہ کے خیال سے اس کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ آنکھیں بھر بھر آنے لگیں۔ وہاں بڑے بابو کے سوا اور کسی کو نہ جانتی تھی۔ ان سے ہمکلام ہونے کا اسے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔ مگر اس وقت اس کا حجاب رخصت ہو گیا۔ خوف دل کے سارے جذبات پر حاوی ہو جاتا ہے۔

چپڑاسی سے بولی۔ ذرا بڑے بابو سے کہہ دو۔ نہیں چلو میں ہی چلتی ہوں۔

جالپا کی وضع قطع دیکھ کر چپڑاسی رعب میں آ گیا۔ الٹے پاؤں بڑے بابو کے کمرے کی طرف چلا۔ جالپا اس کے پیچھے پیچھے ہو لی۔ بڑے بابو خبر پاتے ہی باہر نکل آئے۔

جالپا نے بڑے بابو کو سلام کر کے کہا۔ معاف کیجئے گا۔ بابو جی آپ کو تکلیف ہوئی۔ انہیں گھر سے چلے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہوئے مگر ابھی یہاں تک نہیں پہنچے آپ سے کچھ کہا تو نہیں۔

رمیش۔ آپ مسز رمانا تھ ہیں؟ مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔ وہ تو وقت کے بڑے پابند ہیں۔ تعجب ہے کہاں رہ گئے۔

جالپا نے چپڑاسی کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتی

ہوں۔

ریش۔ ہاں ہاں! میرے کمرے میں آجاؤ۔ کہیں بیٹھے شطرنج کھیل رہے ہونگے۔

جالپا۔ نہیں بالو جی! مجھے اندیشہ ہے کہ وہ کہیں اور نہ چلے گئے ہوں۔ ابھی آدھ گھنٹہ ہوا انہوں نے میرے نام ایک پرزہ لکھا تھا (جیب سے پرزہ نکال کر) دیکھئے وہ پرزہ موجود ہے۔ آپ ان پر شفقت کی نگاہ رکھتے ہیں۔ آپ سے کیا پردہ۔ ان کے ذمہ کوئی سرکاری رقم تو نہیں آتی۔

ریش نے متعجب ہو کر کہا۔ کیوں انہوں نے تم سے کچھ ذکر نہیں کیا؟

جالپا۔ بالکل نہیں!

ریش۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آج انہیں تین سو روپے جمع کرنے ہیں۔ پرسوں کی آمدنی انہوں نے جمع نہیں کی تھی۔ روپے تھیلی میں رکھے اور نوٹ جیب میں رکھ کر گھر چلے گئے۔ بازار میں کسی نے جیب سے نوٹ نکال لئے۔ (مسکرا کر) چال چلن کے بارے میں تو مجھے کبھی شک کرنے کا موقع نہیں ملا۔ مگر جوانی کے جنون میں اگر طبیعت بہک گئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔

جالپا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی۔ آپ بزرگ ہیں۔ آپ سے کیا عرض کروں مگر جیب سے نوٹوں کا نکل جانا تو کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں۔ ایسے واقعہ آئے دن ہوتے رہتے ہیں کسی نے نکال لئے ہونگے۔ مارے شرم کے انہوں نے مجھ سے کہا نہ ہوگا۔ ذرا سا بھی اشارہ کرتے تو فوراً روپے نکال کر دے دیتی۔ اس میں بات ہی کیا تھی۔

ریش۔ کیا گھر میں روپے ہیں۔

جالپا نے بیباکانہ انداز سے کہا۔ تین سو چاہیئے نہ۔ میں ابھی لئے آتی ہوں۔

ریش۔ اگر وہ گھر پر آگئے ہوں تو بھیج دینا۔

جالپا آ کر تانگے پر بیٹھی اور کوچوان سے چوک چلنے کو کہا۔ اس نے اپنا ہار بیچ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ یوں اس کی کئی سہیلیاں تھیں جن سے اس کو روپے مل سکتے تھے عورتوں میں باہم بڑا خلوص ہوتا ہے۔ مردوں کی طرح ان کی دوستی محض یار پتوں ہی تک ختم نہیں ہو جاتی مگر اس وقت موقع نہ تھا صراف میں پہنچ کر وہ سوچنے لگی کس دوکان پر جاؤں خوف ہو رہا تھا ٹھگی نہ جاؤں۔ اس سرے سے اس سرے تک ایک چکر لگا آئی کسی دکان پر جانے کی ہمت نہ پڑی۔ ادھر وقت بھی گزرا جاتا تھا۔ آخر ایک دوکان پر ایک بوڑھے صراف کو دیکھ کر اس کا حجاب کچھ کم ہوا۔ صراف بڑا گھاگ تھا جالپا کو جھجکتے اور ہچکچاتے دیکھ کر سمجھ گیا۔ اچھا شکار پھنسا۔

جالپا نے ہار دکھا کر کہا۔ میں اسے بیچنا چاہتی ہوں۔

صراف نے ہار کو ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا اور بولا۔ مال تو چوکھا نہیں ہے آپ نے کہاں بنوایا تھا؟

جالپا۔ اس سے تمہیں کیا مطلب؟ تمہیں لینا ہو تو بتلاؤ۔ کیا دو گے۔

صراف نے ساڑھے تین سو دام لگائے اور بڑھتے بڑھتے چار سو تک پہنچا چھ سو کی چیز چار سو میں دیتے قلق تو ہو رہا تھا لیکن مجبوری تھی، مارے لاج کے ہار کو بڑی احتیاط سے پہنا تھا، مفت میں دو سو کا نقصان ہو رہا تھا مگر کوئی علاج نہ تھا روپے لئے اور چل کھڑی ہوئی۔ جس ہار کو اس نے اتنے ارمانوں سے خریدا تھا۔ اُسے آج آدھے داموں بیچکر اُسے ذرا بھی رنج نہ ہوا۔ بلکہ ایک غرور آمیز مسرت ہو رہی تھی جس وقت رما کو معلوم ہوگا کہ اس نے روپے ادا کر دیئے ہیں انہیں کتنی خوشی ہوگی، کہیں دفتر پہنچ گئے ہوں وہ روپے لئے پہنچے تو بڑا لطف آئے۔

رمیش بابو اسے دیکھ کر بولے۔ کیا ہوا گھر پر ملے۔

جالپا۔ کیا ابھی تک یہاں نہیں آئے۔ گھر پر تو نہیں ملے۔ یہ کہہ کر اس نے

نوٹوں کا پلندہ رشی بابو کی طرف بڑھا دیا۔ بڑے بابو نے نوٹوں کو گن کر کہا۔ ٹھیک ہیں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اب تک ہیں کہاں۔ اگر نہ آنا تھا تو کم سے کم ایک خط تو لکھ دیتے مجھے تو بڑا تردد ہو رہا ہے تم بڑے موقعہ سے آگئیں۔ اس وقت تمہاری دور اندیشی اور ذہانت دیکھ کر جی خوش ہو گیا شریف عورتوں کا یہی وطیرہ ہے۔

جالپا جب گھر چلی تو اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ قد میں کچھ اونچی ہو گئی ہے اس کے جسم میں خون کی حرکت زیادہ تیز ہو گئی تھی اسے یقین تھا رما اگر مکان پر متفکر بیٹھے ہونگے وہ جا کر پہلے انہیں خوب آڑے ہاتھوں لے گی اور خوب شرمندہ کرنے کے بعد یہ خبر سنائے گی۔ لیکن جب گھر پہنچی تو رما ناتھ کا کہیں نشان نہ تھا۔

جاگیشوری نے پوچھا۔ کہاں چلی گئی تھیں دھوپ میں بہو۔

جالپا۔ ایک کام سے چلی گئی تھی۔ آج انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔

جاگیشوری۔ دفتر گئے ہونگے۔

جالپا۔ نہیں دفتر نہیں گئے۔ وہاں سے ایک چپڑاسی پوچھنے آیا تھا۔

یہ کہتی ہوئی وہ اوپر چلی گئی۔ بچے ہوئے روپے صندوق میں رکھے اور پنکھا جھلنے لگی۔ مگر گرمی سے جسم پھنکا جا رہا تھا۔ اس کے کان دروازہ کی طرف لگے ہوئے تھے۔ ابھی تک اسے اس کا ذرا بھی اندیشہ نہ تھا کہ رما نے پردیس کی راہ لی ہے چار بجے تک تو جالپا کو بہت زیادہ تردد نہ ہوا۔ لیکن جیوں جیوں دن ڈھلنے لگا۔ اس کا انتشار بڑھنے لگا۔ آخر وہ سب سے اونچی چھت پر چڑھ گئی۔ حالانکہ وہ چھت مخدوش ہونے کے باعث کوئی اوپر نہیں جاتا تھا اور وہاں سے چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن رما کسی طرف سے آتا نہ دکھائی دیا۔

جب شام ہو گئی اور رما گھر نہ آیا تو جالپا کی طبیعت گھبرانے لگی۔ آخر کہاں چلے

گئے۔ اگر کسی دوست کے گھر ہوتے تو کیا اب تک نہ لوٹتے، معلوم نہیں جیب میں کچھ ہے یا نہیں، بیچارے دن بھر سے نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہے ہونگے۔ وہ پھر کچھتانے لگی ان کا خط پڑھتے ہی اس نے کیوں نہ ہار نکال کر دے دیا۔ کیوں نہ پس و پیش میں پڑ گئی۔ وہ بیچارے مارے شرم کے گھر نہ آتے ہونگے۔

چراغ جل گئے تو اس سے ضبط نہ ہو سکا، سوچا شاید رتن سے کچھ پتہ چلے، لیکن اس کے بنگلہ پر گئی تو معلوم ہوا آج تو وہ ادھر آئے ہی نہیں۔

تب جالپا نے ان سبھی میدانوں اور پارکوں کو چھان ڈالا۔ جہاں رما کے ساتھ وہ اکثر گھومنے جایا کرتی تھی اور نو بجتے بجتے مایوس گھر واپس آئی۔ اب تک اس نے اپنے آنسوؤں کو روکا تھا۔ شاید کچھ اُمید تھی کہ گھر پر آ گئے ہوں۔ لیکن جب گھر میں قدم رکھتے ہی اسے معلوم ہو گیا کہ وہ اب تک نہیں آئے تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یہ شبہ اب مضبوط ہو گیا کہ وہ کہیں چلے گئے۔ ایک موہوم سی اُمید تھی کہ شاید میرے پیچھے آئے ہوں اور پھر چلے گئے ہوں۔ جا کر جاگیشوری سے پوچھا۔ کیا وہ آئے ہی نہیں یا آ کر کہیں چلے گئے۔

جاگیشوری۔ آئے ہی نہیں۔ یار دوستوں میں بیٹھے بیٹھے غپ شپ کر رہے ہونگے۔ گھر تو سرائے ہے، دس بجے گھر سے نکلے تھے ابھی تک پتہ نہیں۔

جالپا۔ وہ دفتر سے گھر آ کر تب کہیں جاتے تھے۔ آج تو آئے ہی نہیں، دفتر بھی نہیں گئے۔ کہیئے تو گوپی بابو کو بھیجدوں۔ جا کر دیکھیں کہاں رہ گئے۔

جاگیشوری۔ لڑکے اس وقت کہاں جائیں گے۔ ان کا کیا ٹھیک ہے، کہیں شطرنج ہو رہی ہوگی۔ تھوڑی دیر اور دیکھ لو۔ پھر کھانا اٹھا کر رکھ دینا۔ کوئی کہاں تک انتظار کرے۔

جالپا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ دفتر کی کوئی بات اس سے نہ کہی ——

جاگیشوری سُن کر گھبرا جاتی اور اسی وقت رونا پیٹنا شروع کر دیتی۔ وہ اوپر جا کر لیٹ گئی۔ اور چُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ رہ رہ کر ایسی بے قرار ہو جاتی تھی کہ اس کا سانس تیز چلنے لگتا تھا۔ بار بار خیال آتا اگر رات بھر نہ آئے تو کیا کرنا ہوگا۔ جب تک کچھ پتہ نہ چلے کہ وہ کدھر گئے تب تک کوئی جائے تو کہاں جائے۔ آج اس کے ضمیر نے پہلی بار تسلیم کیا کہ یہ سب اس کی کرنی کا پھل ہے۔ مانا کہ اس نے زیوروں کے لئے کبھی ضد نہیں کی۔ لیکن اس نے کبھی صاف طور سے منع بھی تو نہیں کیا۔ اگر چوری ہو جانے کے بعد اس نے کہرام نہ مچایا ہوتا تو آج یہ نوبت کیوں آتی۔ مایوسی کی حالت میں جالپا اپنے ہی کو مطعون کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی رما رشوت لیتا ہے اس کا خرچ آمدنی سے زیادہ ہے۔ پھر بھی اس نے کبھی منع نہیں کیا۔ اس نے خود کیوں اپنی کملی کے باہر پاؤں پھیلایا۔ کیوں اسے روز سیر و تفریح کی سوجھتی تھی۔ جب رما اسے تحفہ لالا کر دیتا ہے تو کیوں پھولی نہ سماتی تھی۔ اس ذمہ داری کو بھی جالپا اس وقت اپنے اوپر ہی لے رہی تھی۔ کیوں اسے یہ سمجھ نہ آئی کہ آمدنی سے زیادہ خرچ کرنے کی سزا ایک دن بھگتنی پڑے گی۔ اب اسے ایسی کتنی ہی باتیں یاد آ رہی تھیں جن سے رما کی پریشانی اور بے اطمینانی کا اظہار ہوتا تھا۔ مگر اس نے کبھی ان معاملات کی طرف دھیان نہ دیا۔

جالپا انہیں افسوسناک خیالات میں ڈوبی نہ جانے کب تک بیٹھی رہی۔ جب چوکیداروں کی سیٹیوں کی آواز اس کے کانوں میں آئی تو وہ نیچے جا کر جاگیشوری سے بولی۔ وہ ابتک نہیں آئے۔ آپ چل کر کھانا کھا لیجئے۔

جاگیشوری بیٹھے بیٹھے جھپکیاں لے رہی تھی۔ چونک کر بولی۔ کہاں چلے گئے تھے جالپا۔ وہ تو اب تک نہیں آئے۔

جاگیشوری۔ اب تک نہیں آئے۔ آدھی رات تو ہو گئی ہوگی۔ جاتے وقت تم سے کچھ کہا بھی نہیں!

جالپا۔ کچھ بھی نہیں۔
جاگیشوری۔ تم نے تو کچھ نہیں کہا۔
جالپا۔ میں بھلا کیا کہتی۔
جاگیشوری۔ تو میں تمہارے دادا جی کو جا کر جگاؤں۔
جالپا۔ اس وقت جگا کر کیا کیجئے گا۔ آپ چل کر کچھ کھا لیجئے۔
جاگیشوری۔ مجھ سے اب کچھ نہ کھایا جائے گا۔ ایسا من موجی لڑکا ہے کہ کچھ کہا نہ سُنا نہ جانے کہاں بیٹھ رہا۔ کم سے کم کہلا تو دیتا کہ میں اس وقت نہ آؤں گا۔
جاگیشوری پھر لیٹ رہی۔ مگر جالپا اسی طرح بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ ساری رات گزر گئی۔ پہاڑ سی رات جس کا ایک ایک پل ایک ایک برس کی طرح کٹ رہا تھا

(۲۳)

ایک ہفتہ گذر گیا رما کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ بیچارے رمیش بابو دن میں کئی کئی بار آ کر پوچھ جاتے ہیں۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں، صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ رما ناتھ گیارہ بجے اسٹیشن کی طرف گئے تھے۔ منشی دیا ناتھ کا خیال ہے اگرچہ وہ اسے برملا ظاہر نہیں کرتے کہ رما نے خودکشی کر لی۔ ایسی حالتوں میں یہی ہوا کرتا ہے اس کی مثالیں انہوں نے خود آنکھوں دیکھی ہیں۔ ساس اور سسر دونوں ہی جالپا پر سارا الزام تھوپ رہے ہیں۔ صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ یہی اس کی جان کی گاہک ہوئی۔ اس نے ان کا ناک میں دم کر دیا۔ پوچھو تھوڑی سی تو آپ کی آمدنی پھر نہیں روز سیر سپاٹے، دعوت تماشے کی کیوں سوجھتی تھی۔ جالپا پر کسی کو رحم نہیں آتا۔ کوئی اس کے آنسو نہیں پونچھتا۔ صرف رمیش بابو اس کی دور اندیشی اور مستعدی کی تعریف کرتے ہیں لیکن منشی دیا ناتھ کی آنکھوں میں ان فعلوں کی کوئی وقعت نہیں۔ آگ لگا کر پانی کے

لیئے دوڑنے سے کوئی بری الذمہ نہیں ہو جاتا۔

ایک دن دیانا تھ کتب خانے سے لوٹے تو منہ لٹکا ہوا تھا۔ ایک تو ان کی صورت یونہی محرمی تھی۔ اس پر منہ لٹکا لیتے تھے تو کوئی بچہ بھی کہہ سکتا تھا کہ ان کا مزاج برہم ہے جاگیشوری نے پوچھا کیا ہے۔ کیا کسی سے بحث ہو گئی کیا۔

دیانا تھ۔ نہیں جی ان تقاضوں کے مارے حیران ہو گیا۔ جدھر جاؤ ادھر نوچنے دوڑتے ہیں۔ نہ جانے کتنا قرض لے رکھا ہے آج تو میں نے صاف کہہ دیا میں کچھ نہیں جانتا میں کسی کا دیندار نہیں۔ جا کر میم صاحب سے مانگو۔

اسی وقت جالپا آپڑی۔ یہ الفاظ اس کے کانوں میں پڑ گئے۔ ان سات دنوں میں اس کی صورت ایسی بدل گئی تھی کہ پہچاننا مشکل تھا۔ روتے روتے آنکھیں سوجھ آئی تھیں۔ منشی جی کے یہ بے رحمانہ الفاظ سن کر جیسے زخم پر نمک پڑ گیا۔ بولی۔ ہاں آپ انہیں سیدھے میرے پاس بھیج دیجئے۔ میں تو انہیں سمجھا دوں گی یا ان کے دام چکا دوں گی۔

دیانا تھ نے برہم ہو کر کہا۔ کیا دے دو گی تم۔ سات سو تو ایک ہی صراف کے ہیں۔ ابھی کے پیسے دیئے ہیں تم نے۔

جالپا۔ اس کے گہنے موجود ہیں۔ مشکل سے دو چار بار پہنے ہیں۔ وہ آئے تو میرے پاس بھیج دیجئے۔ میں اس کی چیزیں واپس کر دوں گی۔ بہت ہو گا دو چار روپے تاوان کے لے لیگا۔

یہ کہتی ہوئی وہ اُوپر جا رہی تھی کہ رتن آ گئی اور گلے سے لگاتی ہوئی بولی۔ کیا اب تک کوئی خبر نہیں ملی۔

جالپا پر ان الفاظ میں ہمدردی اور محبت کا تسلی بخش اثر ہوا۔ یہ غیر ہو کر اتنی دلگیر ہے اور یہاں اپنے ہی ساس اور سسر ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہیں۔ ان اپنوں سے

تو غیر ہی اچھے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ابھی تو کچھ خبر نہیں بہن!

رتن۔ یہ بات کیا ہوئی۔ تم سے کچھ تکرار تو نہیں ہو گئی۔

جالپا۔ ذرا بھی نہیں۔ قسم کھاتی ہوں۔ انہوں نے نوٹوں کے چوری ہونے کا مجھ سے ذکر ہی نہیں کیا۔ اگر اشارہ کر دیتے تو میں روپے دے دیتی۔ جب وہ دوپہر تک نہیں آئے اور میں ان کی تلاش میں دفتر گئی، تب یہ حقیقت کھلی۔ میں نے اسی وقت روپے جمع کر دیئے۔

رتن۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ کسی سے آنکھیں لڑ گئیں۔ دس پانچ دن میں آپ ہی پتہ لگ جائیگا۔ بات سچ نکلے تو جرمانہ دوں۔

جالپا نے ہک بکا کر پوچھا۔ کیا تم نے کچھ سنا ہے؟

رتن۔ نہیں سنا تو نہیں۔ لیکن میرا قیاس ہے۔

جالپا۔ تو تمہارے قیاس بالکل غلط ہیں۔ مجھے اس پر رتی بھر بھی اعتبار نہیں۔ ان میں اور چاہے جتنی برائیاں ہوں، یہ عیب نہیں۔

رتن نے ہنس کر کہا۔ اس فن میں یہ لوگ بڑے استاد ہوتے ہیں تم بیچاری کیا جانو۔

جالپا۔ اگر وہ اس فن میں استاد ہوتے ہیں تو ہم بھی مزاج شناسی کے فن میں کچھ دخل رکھتے ہیں، میں اسے نہیں مان سکتی۔

رتن۔ اچھا چلو کہیں گھومنے چلتی ہو۔

جالپا۔ نہیں اس وقت تو مجھے فرصت نہیں ہے۔ پھر گھر والے یونہی درپے ہو رہے ہیں۔ تب تو زندہ ہی نہیں چھوڑیں گے۔ کدھر جانے کا ارادہ ہے

رتن۔ کہیں نہیں ذرا بازار جانے کا ارادہ ہے۔

جالپا۔ کیا لینا ہے؟

رتن۔ جوہریوں کی دکان پر دو ایک چیز دیکھونگی۔ بس میں تمہارے جیسا نگن

چاہتی ہوں، بابو جی نے بھی کئی مہینے کے بعد روپے لوٹا دیئے۔ اب خود تلاش کروں گی۔

جالپا۔ میرے کنگن میں ایسے کونسے روپ لگے ہیں، بازار میں اس سے بہت اچھے مل سکتے ہیں۔

رتن۔ میں تو اسی نمونے کے چاہتی ہوں۔

جالپا۔ اس نمونے کا تو بنا بنایا بہت مشکل سے ملے گا۔ اور بنوانے میں مہینوں کا جھنجھٹ۔ اگر صبر نہ آتا ہو تو میرا ہی کنگن لے لو۔ میں پھر بنوا لونگی۔

رتن نے اچھل کر کہا، واہ تم اپنا کنگن دے دو تو کیا کہنا ہے موسلوں ڈھول بجاؤ چھ سو کا تھا نہ؟

جالپا۔ ہاں تھا تو چھ سو کا۔ مگر مہینوں صراف کی دکان کی خاک چھاننی پڑی تھی بڑائی تو خود بیٹھ کر کروائی تھی تمہاری خاطر دیدونگی۔

جالپا نے کنگن نکال کر رتن کے ہاتھ میں پہنا دیئے۔ رتن کا چہرہ ایسا شگفتہ ہو گیا گویا کسی کنگلے کو پارس مل گیا ہو۔ احسان مندانہ انداز سے بولی۔ تم جتنا کہو اتنا دے دوں۔ تمہیں دبانا نہیں چاہتی۔ تمہارے لئے یہی کیا کم ہے کہ تم میری اتنی خاطر کر رہی ہو۔ مگر ایک بات ہے ابھی سب روپے نہ دے سکوں گی۔ اگر دو سو روپے پھر دیدوں تو کچھ ہرج ہے۔

جالپا نے فراخدلی سے کہا، کچھ بھی ہرج نہیں۔ کچھ بھی مت دو!

رتن۔ نہیں اس وقت میرے پاس چار سو روپے ہیں یہ میں دئے جاتی ہوں۔ میرے پاس رہیں گے تو کسی کام میں خرچ ہو جائیں گے۔ میرے ہاتھ میں تو روپے ٹکتے ہی نہیں کیا کروں۔ جب تک خرچ نہ ہو جائیں میرے سر پر ایک بوجھ سوار رہتا ہے۔

جالپا کا دل اس وقت مسوس اٹھا۔ اس کی کلائی پر یہ کنگن دیکھ کر رمانا تھ کیسے خوش ہوتے تھے۔ آج وہ ہوتے تو کیا یہ چیز اس طرح جالپا کے ہاتھ سے نکل جاتی۔ پھر

کون جانے کنگن پہننا اُسے نصیب بھی ہوگا یا نہیں۔ اس نے بہت ضبط کیا مگر آنسو نکل ہی آئے۔ رتن اس کے آنسو دیکھ کر بولی۔ اس وقت رکھ لو بہن! پھر لے لونگی جلدی ہی کیا ہے جالپا نے کنگن کی ڈبیا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ کیوں کیا میرے آنسو کو تمہاری خاطر سے دے رہی ہوں۔ نہیں تو یہ چیز جان سے زیادہ تجھے عزیز تھی تمہارے ہاتھ میں دیکھ کر مجھے اتنی ہی خوشی ہوگی جتنی اپنے ہاتھوں میں دیکھ کر۔ ہاں اتنی مہربانی کرنا کہ کسی دوسرے کو مت دے دینا۔

رتن۔ کسی دوسرے کو کیوں دینے لگی۔ میں اسے تمہاری نشانی سمجھونگی۔ آج بہت دنوں کے بعد میری دلی تمنا پوری ہوئی۔ رنج اتنا ہی ہے کہ بابو جی اس وقت نہیں ہیں۔ میرا دل تو کہتا ہے وہ جلد ہی آجائیں گے مارے شرم کے کہیں چلے گئے ہیں اور کوئی بات نہیں۔ وکیل صاحب کو بھی بڑا رنج ہوا۔ لوگ کہتے ہیں وکیل بڑے کٹھ کلیجے ہوتے ہیں مگر ان کی تو یہ حالت ہے کہ کوئی دردناک بات سنی اور تڑپ اٹھے۔

جالپا نے مسکرا کر کہا۔ ایک بات پوچھوں بُرا تو نہ مانوگی، وکیل صاحب سے تمہارا دل تو نہ ملتا ہوگا۔

رتن کا تشنگفتہ بشاش چہرہ ذرا دیر کے لئے تاریک ہوگیا۔ گویا کسی نے ایک ایسے دوست کی یاد دلا دی ہو جس کے نام کو وہ بہت پہلے رو چکی تھی۔ بولی۔ بہن! مجھے تو کبھی خیال بھی نہیں آیا کہ میں جوان ہوں اور یہ بوڑھے۔ میرے دل میں جتنی محبت، جتنا ایثار ہے وہ سب میں نے ان کے اوپر قربان کر دیا ہے۔ محبت جوانی یا دولت یا شکل صورت سے نہیں پیدا ہوتی ہے۔ میرے لئے ہی وہ اس عمر میں اتنی محبت کرتے ہیں اور دوسرا ہے ہی کون، کیا جھوٹی بات ہے۔ کل کہیں گھومنے چلو گی کہو تو شام کو آجاؤں۔

جالپا۔ جاؤنگی تو میں کہیں نہیں مگر تم آنا ضرور۔ دو گھڑی دل بہلے گا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ بُرے بُرے خیال آتے رہتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا انہیں مجھ سے اتنا حجاب کیوں

تھا۔ شاید یہ بھی میری ہی خطا ہے۔ مجھ میں ضرور انہوں نے کوئی ایسی برائی دیکھی ہوگی جس کے باعث وہ مجھ پر اعتبار نہ کر سکتے تھے۔ مجھے اگر رنج ہے تو یہی کہ وہ مجھے غیر سمجھتے رہے جس سے ہمیں محبت ہوتی ہے اس سے پردہ نہیں رکھتے۔

رتن اٹھ کر چلی تو جالپا نے دیکھا کنگن کا بکس میز پڑا ہے بولی۔ اسے لیتے جاؤ بہن کیوں چھوڑے جاتی ہو۔

رتن۔ لے جاؤں گی ابھی کیا جلدی پڑی ہے۔ ابھی پورے روپے تو نہیں دیئے۔

جالپا۔ نہیں نہیں لیتی جاؤ۔ میں نہ مانوں گی۔

مگر رتن سیڑھی سے نیچے اتر گئی۔ جالپا ہاتھ میں کنگن لئے کھڑی رہ گئی۔

تھوڑی دیر بعد جالپا نے صندوق سے پانچسو روپے نکالے اور دیانا تھ کے پاس جا کر بولی۔ یہ روپے چرنداس کے پاس بھجوا دیجئے۔ باقی روپے بھی دو چار دن میں دے دوں گی۔

دیانا تھ نے خفیف ہو کر کہا۔ روپے کہاں سے مل گئے۔

جالپا بیباکانہ لہجے میں بولی۔ رتن کے ہاتھ اپنا کنگن بیچ دیا۔

دیانا تھ اس کا منہ تاکنے لگے۔

(۲۴)

ایک مہینہ گزر گیا۔ الہ آباد کے سب سے کثیر الاشاعت روزانہ اخبار میں ایک نوٹس نکل رہا ہے جس میں رما نا تھ کو واپس آنے کی تحریک کی گئی ہے اور اس کا سراغ لگانے والے کو پانچ سو روپے انعام دینے کا وعدہ کیا گیا ہے مگر ابھی کہیں سے کوئی خبر نہیں آئی۔ جالپا فکر اور غم سے گھلتی جاتی ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر دیانا تھ کو بھی اس پر رحم آنے لگا ہے۔ آخر انہوں نے ایک دن اپنے سمدھی دین دیال کو لکھا۔ آپ آ کر

کچھ دنوں کے لئے ہو کو رخصت کرانے جایئے۔ دینڈیال خط پاتے ہی گھبرائے ہوئے آئے۔ مگر جالپا نے میکے جانے سے انکار کر دیا۔

دینڈیال نے کچھ ترش ہو کر کہا۔ کیا یہاں پڑے پڑے جان دے دینے کا ارادہ کر لیا ہے۔

جالپا نے خود دارانہ انداز سے کہا۔ اگر جان کو اس طرح جانا ہے تو کون روک سکتا ہے، لیکن میں ابھی مرنے کی نہیں۔ سچ جانیئے غم نصیبوں کو موت بھی نہیں پوچھتی۔

دینڈیال۔ آخر چلنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ شہزادی اور بسنتی دونوں آئی ہوئی ہیں ان کے ساتھ ہنسنے بولنے سے جی بہلتا رہے گا۔

جالپا۔ یہاں اماں جی اور لالہ کو چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ جب رونا ہی لکھا ہے تو روؤں گی۔

دینڈیال۔ یہ بات کیا ہوگی۔ سنتے ہیں کچھ قرض ہو گیا تھا۔ کوئی کہتا ہے سرکاری رقم کھا گئے تھے۔

جالپا۔ جس نے آپ سے یہ کہا۔ اس نے سراسر جھوٹ کہا۔

دینڈیال۔ تو پھر چلے کیوں گئے۔

جالپا۔ یہ میں بالکل نہیں جانتی۔ مجھے خود تعجب ہوتا ہے۔

دینڈیال۔ منشی دیانا تھ سے تو کھٹ پٹ نہیں ہوگئی۔

جالپا۔ لالہ جی کے سامنے تو وہ سر تک نہیں اٹھاتے تھے۔ پان تک نہیں کھاتے تھے۔ کھٹ پٹ کیا ہوگی۔ انہیں گھومنے کا شوق تھا۔ سوچا ہوگا یوں تو کوئی جانے نہ دے گا چلو بھاگ چلیں۔

دینڈیال۔ شاید ایسا ہی ہو۔ کچھ لوگوں کو دیش بدیش پھرنے ہی کی سنک ہوتی ہے۔ تمہیں یہاں جو تکلیف ہو صاف صاف کہہ دو۔ خرچ کے لئے کچھ بھیج دیا کروں۔

جالیا نے تمکنت سے کہا۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ داداجی آپ کی دعا سے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔

دیا ناتھ اور جاگیشوری نے جالپا کو سمجھایا مگر وہ جانے پر راضی نہ ہوئی۔ تب دیا ناتھ جھنجلا کر بولے۔ یہاں دن بھر پڑے پڑے رونے سے تو اچھا ہے۔

جالپا۔ کیا وہ کوئی دوسری دنیا ہے۔ یا وہاں جا کر میں کچھ اور ہو جاؤں گی۔ جب ہنسنا تھا تب ہنستی تھی۔ جب رونا ہے تو روؤں گی۔ رما کا لے کوسوں چلے گئے ہوں لیکن مجھے ہر دم بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ان کا جسم نہیں ہے لیکن گھر کی ایک ایک چیز میں وہ بسے ہوئے ہیں۔ وہاں یہ تسکین بھی نہ رہے گی۔

دینِدیال سمجھ گئے یہ غرور کی پتلی اپنی ضد نہ چھوڑے گی۔ اُٹھ کر باہر چلے آئے۔ شام کو چلتے وقت انہوں نے پچاس روپے کا ایک نوٹ جالپا کی طرف بڑھا کر کہا۔ اسے رکھ لو شاید کوئی ضرورت پڑے۔

جالپا نے سر ہلا کر کہا۔ مجھے اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ دادا ہاں آپ کی دعا چاہتی ہوں ممکن ہے آپ کی دعا سے میری مراد بر آئے۔

دینِدیال کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ نوٹ چارپائی پر رکھ کر باہر چلے آئے۔

کوار کا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ ابر کے خنک ٹکڑے کبھی کبھی آسمان پر دوڑتے نظر آجاتے تھے۔ جالپا چھت پر لیٹی ہوئی ان آسمانی وجودوں کی خوش مکھلیاں دیکھا کرتی تھی۔ وہ طرح طرح کے رنگ بدلتے۔ بھانت بھانت کے روپ بھرتے کبھی محبت سے باہم بغلگیر ہو جاتے۔ کبھی روٹھ کر منہ پھیر لیتے۔ ان بادلوں کے ٹکڑے میں بھی اسے رما ناتھ ہی کی تصویر پھرتی نظر آتی۔

مصیبت میں ہماری نگاہیں خود شناسی کی جانب مائل ہو جاتی ہیں۔ جالپا کو اب کبھی گمان ہوتا تھا کہ ایشور نے اسے اس کی خطاؤں کی سزا دی ہے۔ آخر رما ناتھ دوسرے

کا گلا دبا کر ہی تو روپے لاتے تھے۔ وہ روپے دیکھ کر وہ کتنی خوش ہوتی تھی۔ انہیں روپوں سے تو ہمیشہ آرائش و نمائش کی چیزیں آتی رہتی تھیں، ان چیزوں کو دیکھ کر اب اس کا جی جلتا تھا۔ انہیں کے لئے تو رمانا تھ کو گھر سے بھاگنا پڑا۔ یہ چیزیں اب اس کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح چبھتی تھیں۔

آخر اس نے ایک دن ان سب چیزوں کو جمع کیا۔ مخملی سلیپر، ریشمی موزے طرح طرح کی بیلیں، فیتے، پن۔ کنگھیاں، آئینہ، کوئی کہاں تک گنائے اچھا خاصہ ایک انبار ہو گیا۔ اس نے ان چیزوں کو گنگا میں ڈبو دینے کا ارادہ کیا۔ اب سے اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوگا۔ انہیں تکلفات کے پیچھے آج اس کی یہ درگت ہو رہی ہے۔ آج وہ اس طلسم کو توڑ ڈالے گی۔ ان میں کتنی ہی چیزیں تو اتنی ہی خوبصورت تھیں کہ ان کو پھینکتے ہوئے قلق ہوتا تھا۔ آدھی رات تک وہ ان چیزوں کو اٹھا اٹھا کر رکھتی تھی۔ گویا کسی سفر کی تیاری کر رہی ہے، ہاں یہ فی الواقعہ سفر ہی تھا۔ نمائش سے حقیقت کا باطل سے حق کا دل میں سوچ رہی تھی اب اگر ایشور کے فضل و کرم سے وہ پھر لوٹ کر گھر آئے تو وہ نہایت سادہ، بے تکلف زندگی بسر کرے گی۔ حرام کی ایک کوڑی بھی گھر نہ آنے دے گی۔

جیوں ہی رات کے چار بجے سڑک پر لوگوں کے آنے جانے کی آہٹ ملنے لگی، جالپا نے بقچہ اٹھایا اور اشنان کرنے چلی۔ بقچہ بہت وزنی تھا۔ اسے ہاتھ میں لٹکا کر دس قدم چلنا بھی مشکل ہو گیا، بار بار ہاتھ بدلتی تھی۔ یہ خوف ہو رہا تھا کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ بوجھ لے کر چلنے کی اسے کبھی نوبت نہ آئی تھی۔ آخر جب ہاتھ شل ہو گئے تو اپنے بقچے کو پیٹھ پر رکھ لیا اور قدم بڑھا کر چلنے لگی۔ لمبا گھونگٹ نکال لیا تھا کہ کوئی پہچان نہ سکے۔

وہ گھاٹ کے قریب پہنچی، تو روشنی پھیل چکی تھی۔ یکایک اس نے رتن کو اپنی

موٹر پر آتے دیکھا۔ اس نے چاہا کہ سر جھکا کر کترا کر نکل جائے لیکن رتن نے دور ہی سے پہچان لیا۔ اور موٹر روک کر بولی۔ کہاں جا رہی ہو بہن۔ یہ بیٹھ پر لفچہ کیسا ہے۔

جالپا نے بے نقاب ہو کر کہا۔ ذرا گنگا اشنان کرنے جا رہی ہوں۔

رتن۔ میں تو اشنان کر کے لوٹ آئی۔ لیکن چلو تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ تمہیں گھر پہنچا دوں گی۔ لاؤ یہ لفچہ رکھ دو۔

جالپا۔ یہ کچھ بھاری نہیں ہے۔ تم جاؤ تمہیں دیر ہو گی۔ میں چلی جاؤں گی۔

مگر رتن نے نہ مانا۔ کار سے اتر کر اس کے ہاتھ سے لفچہ لے ہی لی اور گاڑی میں رکھتی ہوئی بولی۔ یہ تو بڑا بھاری ہے۔ کیا بھرا ہے تم نے اس میں؟ کھول کر دیکھوں؟

جالپا۔ اس میں تمہارے دیکھنے کے لائق کوئی چیز نہیں ہے۔

رتن نے لفچہ کو کھول کر دیکھا تو حیرت میں آ کر بولی۔ ان چیزوں کو کہاں لئے جاتی ہو؟

جالپا نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ انہیں گنگا میں ڈبا دونگی۔

رتن نے اور بھی متعجب ہو کر کہا۔ گنگا میں! کچھ پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ چلو گھر چلیں۔ ان چیزوں کو رکھ کر پھر لوٹ آنا۔

جالپا نے قطعی طور پر کہا۔ نہیں رتن میں ان چیزوں کو ڈبا کر ہی جاؤں گی۔

رتن آخر کیوں؟

جالپا۔ پہلے کار کو بڑھاؤ۔ پھر بتاؤں۔

رتن۔ نہیں پہلے بتا دو۔

جالپا۔ نہیں یہ غیر ممکن ہے۔ پہلے کار کو بڑھاؤ۔

رتن نے مجبور ہو کر کار بڑھائی اور بولی۔ اچھا اب تو بتاؤ۔

جالپا نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا۔ اتنی بات تو تمہیں پہلے ہی سمجھ لینی چاہیئے تھی۔ اب یہ چیزیں میرے کس کام کی ہیں۔ انہیں دیکھ کر خواہ مخواہ جلن ہوتی ہے۔ جب دیکھنے

والا ہی نہ رہا تو انہیں رکھ کر کیا کروں گی۔

رتن نے ایک لمبی سانس کھینچی اور بولی۔ تم بالوجی کے ساتھ بڑی بے انصافی کر رہی ہو۔ بہن! ان چیزوں کو وہ کتنی اُمنگوں سے لائے ہونگے۔ تمہارے جسم پر ان کی زیبائش دیکھ کر وہ کتنے خوش ہونگے۔ ایک ایک چیز ان کی محبت کی یادگار ہے۔ انہیں گنگا میں ڈبا دو گی۔

جالپا اب فکر میں ڈوب گئی۔ دل میں پس و پیش ہونے لگا۔ مگر ایک لمحہ میں اس نے فیصلہ کر لیا۔ بولی۔ جب تک یہ چیزیں میری آنکھوں سے دُور نہ ہو جائیں گی میری طبیعت کو سکون نہ ہوگا۔ انہیں تکلفات نے میری یہ درگت کی ہے۔ یہ محبت کی نشانیاں نہیں۔ میری مصیبت کی گٹھڑی ہے۔ محبت کا نقش تو میرے دل پر ہے۔

رتن۔ تمہارا دل بڑا سخت ہے جالپا! میں تو شاید ایسا نہ کر سکتی۔

جالپا۔ ایشور نہ کرے کہ تمہیں ایسا موقعہ آئے۔ سچ پوچھو تو انہوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ جو آدمی اپنی بیوی سے پردہ رکھتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ میں بالوجی کی جگہ ہوتی تو یوں ناتا توڑ کر کبھی نہ بھاگتی۔ اپنے دل کا سارا درد دُکھ سناتی۔ اور جو کچھ کرتی ان کے مشورے سے کرتی۔ عورت اور مرد میں پردہ کیسا۔

رتن نے مسکرا کر کہا۔ ایسے مرد تو بہت کم ہونگے جو عورت سے اپنا دل کھولتے ہوں جب تم خود دل میں چور رکھتی ہو تو ان سے کیوں اُمید رکھتی ہو کہ وہ تم سے پردہ رکھیں۔ تم ایمان سے کہہ سکتی ہو کہ تم نے ان سے کوئی بات نہیں چھپائی۔

جالپا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ میں نے تو اپنے دل میں کبھی چور نہیں رکھا۔

رتن نے زور دے کر کہا۔ جھوٹ بولتی ہو۔ بالکل جھوٹ اگر تم نے ان پر اعتبار کیا ہوتا تو وہ بھی ضرور کھلتے۔

جالپا اس الزام کو اپنے سر سے نہ ٹال سکی۔ اسے آج معلوم ہوا کہ پردہ داری کا آغاز پہلے اسی کی جانب سے ہوا تھا۔

گنگا کا کنارا آ پہنچا۔ موٹر کار رک گئی۔ جالپا اتری اور بقچی کو اٹھانے لگی مگر رتن نے اس کا ہاتھ ہٹا کر کہا۔ نہیں میں اسے نہ لے جانے دوں گی۔ سمجھ لو ڈوب گئے۔ مجھ پر اتنا رحم کرو بہن سمجھ کر۔

جالپا۔ بہن کے ناتے تمہارے پیر دھو سکتی ہوں۔ مگر ان کانٹوں کو دل میں نہیں رکھ سکتی۔

رتن نے بھویں سکوڑ کر کہا۔ کسی طرح نہ مانو گی۔

جالپا۔ نہ۔

رتن نے بے اعتنائی سے منہ پھیر لیا۔ جالپا نے بقچی اٹھائی اور تیزی سے نیچے اتر کر اسے پانی میں پھینک دیا۔ اپنے نفس پر فتح پا کر اس کا چہرہ منور ہو گیا۔ آج اسے جتنا غرور اور جتنی مسرت ہوئی اتنی ان چیزوں کو پا کر بھی نہ ہوئی تھی۔ ان صدہا آدمیوں میں جو اس وقت اشنان و دیان کر رہے ہیں شاید کسی کو بھی اپنے باطن میں نورانیت کا ایسا احساس نہ ہوا ہوگا۔ گویا صبح کو سنہری شعاعیں اس کے جسم کے ایک ایک ذرہ میں ناچ رہی ہوں۔

جب وہ اشنان کر کے اوپر آئی تو رتن نے پوچھ لیا۔ ڈبا دیا۔

جالپا۔ ہاں اور کیا کرتی۔

رتن بڑی سنگدل ہو۔

جالپا۔ یہی سنگدلی پر فتح پاتی ہے۔ اگر کچھ دن پہلے سنگ دل ہو جاتی تو آج یہ دن کیوں آتا۔

موٹر کار چل پڑی۔

(۲۵)

رمانا تھ کو کلکتے آئے ہوئے دو ماہ سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ ابھی تک دیبی دین